سیرت رسولؐ اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین[1]

(۲)

شہید عشق

رشید احمد جالندھری

طه حسین نے ''علی هامش السیرۃ'' کی دوسری جلد ۱۹۳۷ء میں لکھی۔ اس جلد کا هیرو ایک رومی فلسفی هے جو عیش و عشرت کی زندگی اور مروجه مذهبی افکار سے تنگ آ کر تلاش حق کے لئے قصر شاهی کو چھوڑ دیتا هے، اور اس راہ میں آنے والی هر مشکل کو خوش آمدید کہتا هے۔ طه حسین نے اس فلسفی کی سرگزشت بیان کرتے هوئے کہا که همارا فلسفی ساتھی مصر کے گورنر کا مصاحب تھا۔ اس کے محل میں عیش و عشرت کی بزم جمتی جس میں رقص و سرور سے گرمی آتی۔ ایک دفعه ایک مطربه نے گانا سنایا جس پر گورنر اور اس کے دونوں ساتھی، جن میں سے ایک فلسفی هے، افسردہ خاطر هوئے۔ مطربه سے نغمه کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا که یه گانا دراصل ایک امانت هے جو اسے اپنے خاندان سے ورثے میں ملی هے۔ اس کی ماں، نانی اور دوسری بزرگوار بڑی مائیں اس گانے کے ذریعے اپنے اس اندرونی سوزو گداز اور قلق و اضطراب کا اظہار کیا کرتی تھیں، جن سے ان کے دل معمور تھے، کیونکه انھیں اپنے موروثی عقائد سے سرکاری طور پر دست بردار هونے کے لئے مجبور کیا گیا تھا۔ عیش و طرب کی یه محفلیں برابر جاری رهیں اور زندگی ایک معمول کے مطابق چلتی رهی۔ گورنر انتظامی امور کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو عیسائی دین کا محافظ بھی سمجھتا تھا۔ عیسائی دین کے خلاف کسی قسم کی فکری یا نظری بغاوت وفاداری کے خلاف تھی۔ لیکن بالآخر فلسفی ایک دن

۱۔ پہلی قسط کیلئے دیکھئے فکر و نظر مارچ ۱۹۷۷ء

اس قسم کی بے کیف زندگی سے تنگ آگیا اور اس کے دل میں بڑی شدت سے یہ احساس ابھرا کہ عیسائی مذہب کو کیوں بزور عوام پر ٹھونسا جا رہا ہے۔ اس قسم کے خیالات اسے برابر ستاتے رہے، حتی کہ خود گورنر کو بھی پتہ چل گیا۔ اس نے فلسفی سے کہا کہ مذہب کے بارے میں تمہاری وفاداری متزلزل ہو رہی ہے اور تم شک و شبہ کا اظہار بر ملا کر رہے ہو، جس کا پتہ خود قیصر کو بھی چل گیا ہے۔ یہ بات تمہارے حق میں اچھی ثابت نہ ہوگی۔ گورنر کے دوسرے مصاحب نے جو خود مذہب کے معاملے میں سنجیدہ نہیں تھا، اپنے ساتھی سے ازراہ نصیحت کہا کہ وہ قیصر روم اور عیسائی مذہب کے بارے میں کچھ نہ کہے۔ لیکن فلسفی نے نہ تو گورنر کی بات پر کوئی دھیان دیا اور نہ ہی اپنے ساتھی کی نصیحت کو سنا۔ وہ قیصر کی مملکت کو چھوڑ کر کہیں دور ایسی جگہ جانا چاہتا تھا، جہاں پر ہر آدمی اپنے عقیدے اور رائے میں آزاد ہو، چنانچہ اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میں اپنے افکار کی خاطر اس ملک کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ یونان کے جو فلسفی اپنے پرانے عقائد کی خاطر وطن چھوڑ کر ایران چلے گئے تھے، میرے دل میں ان کی عزت ہے۔ غرض یہ کہ اس قسم کے آزادانہ خیالات فلسفی کے دل و دماغ میں گھومتے رہے اور اس نے اپنے طور پر اپنی اجتماعی زندگی سے دست بردار ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اس اثناء میں ایک دن وہ اپنے ساتھی کے ساتھ گورنر کے ہاں بیٹھا تھا کہ ایک بوڑھا راہب گورنر سے ملنے آیا جس سے نہ صرف گورنر آشنا تھا بلکہ یہ دونوں مصاحب بھی پوری طرح واقف تھے۔ یہ راہب دراصل ایک تاجر تھا لیکن وقت کے مذہبی رسم و رواج اور اجتماعی زندگی سے تنگ آکر اس نے رہبانیت اختیار کر لی تھی اور اس سلسلے میں اس نے عرب علاقوں کی سیر بھی کی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے مختلف مذہبی رہنماؤں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مذہب کے بارے میں اس کے پاس اچھی خاصی معلومات تھیں۔

گورنر ہاؤس میں راہب سے فلسفی کی یہ ملاقات ایک تاریخی ملاقات ثابت ہوئی۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مذہب اور فلسفے میں بیر ہے، جہاں فلسفے کی حکمرانی ہے وہاں مذہب کا سر نیچا ہے اور جہاں مذہب کو

بالادستی حاصل ہے وہاں فلسفہ پابہ زنجیر ہے،۲ اس مفروضہ کا حقیقت سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو لیکن طہ حسین نے فلسفی اور راہب کی ملاقات جس انداز سے کرائی ہے اور دونوں نے جس طریق سے زندگی کے مسائل اور انسانی ضمیر کی بے اطمینانی پر جو گفتگو کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ طہ حسین ان لوگوں میں سے ہیں جو فلسفہ اور مذہب میں کوئی تصادم یا تضاد نہیں دیکھتے۔ ان کی رائے میں دونوں کی منزل ایک ہے، لیکن راہیں مختلف۔ البتہ مذہب کی روح جس یقین اور اعتماد سے روشن ہے، فلسفہ اس سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طہ حسین راہب کو مطمئن دیکھتا ہے اور فلسفی کو مضطرب۔ طہ حسین نے راہب و فلسفی کے مکالمہ میں اس امر کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ایمان کا عقل سے سند لینا ضروری نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ عقل بعض حقائق کا انکار کر دے۔ لیکن انسانی وجدان بلا تامل ان کا اعتراف کر لیتا ہے، ڈاکٹر رادھا کرشن نے کہا تھا: ہم دینیات کا انکار کر دیں، مگر واقعات سے انکار نہیں کر سکتے۔ زندگی کے الاؤ کو جو ہماری آنکھوں کے سامنے روشن ہے، ماننا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ان قیاس آرائیوں کو نہ مانیں جو اس الاؤ کے آس پاس بیٹھ کر حقہ پینے والے کیا کرتے ہیں۳،۔ بہر نوع گورنر ہاؤس میں راہب، گورنر اور اس کے دونوں مصاحبوں نے ایک لمبی محفل جمائی۔ جس میں فلسفی نے راہب کی زاویہ نشینی کو بھی موضوع سخن بنایا۔ اسی محفل میں فلسفی کے ساتھی نے گورنر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ آپ کا یہ مصاحب یعنی فلسفی اس سر زمین کو چھوڑنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ گورنر یہ سن کر حیران رہ گیا لیکن راہب نے فلسفی کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اگر یہ درست ہے تو پھر تم پر خدا کی رحمت کا نزول ہو رہا ہے، تم اپنی موجودہ زندگی سے

---

۲ - عہد حاضر میں فرانس کے معروف فلسفی رینان نے اس رائے کا زورشور سے پرچار کیا، حتیٰ کہ جمال الدین افغانی رحمہ نے بھی اس رائے میں ایک حد تک رینان کا ساتھ دیا۔ ۱۸۸۲ء میں پیرس میں رینان افغانی مباحثہ اسلامیات اور فلسفہ کے طالب علموں کیلئے دل چسپی کا سروسامان رکھتا ہے۔

۳ - قومی تہذیب کا مسئلہ از عابد حسین، اس مسئلے پر ڈاکٹر محمد اقبال رحہ اور ابوالکلام طہ کے ساتھ ہیں، حالانکہ یہ دونوں جمال الدین افغانی سے متاثر تھے اس لئے یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ رینان کو افغانی کے خیالات سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔

بھاگ کر اس کی پناہ میں آنا چاہتے ہو۔ تم میرے ساتھ چلو، میرا خیال ہے میری خانقاہ تمہارے لئے سب سے بہتر ثابت ہوگی۔ اور میں بھی شاید تم سے بہتر اپنی خانقاہ کو کوئی تحفہ نہ دے سکوں۔ راھب کے اس کہنے پر گورنر کے مصاحب نے راھب سے کہا کہ آپ یہاں دوستوں کے درمیان تفریق کے لئے آئے ہیں۔ پہلے خود آپ اپنے وطن اور ساتھیوں سے جدا ہوئے اور اب فلسفی کو بھی ساتھ لئے جا رہے ہو۔ راھب نے جواب میں کہا کہ اگر میرے مقدور میں ہو تو میں تم سب کو تمہاری موجودہ زندگی سے باھر نکال کر اپنی خانقاہ میں لے چلوں اور یہ بات میرے لئے انتہائی خوشی اور مسرت کا باعث بنے گی۔ اس سے بڑھ کر آدمی پر کونسی خدائی نعمت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو گناہ کی زندگی سے نجات دلائے۔ راھب نے فلسفی سے مزید کہا کہ مجھے تم سے ھمدردی ہے اس لئے نہیں کہ قیصر روم کو تمہارے بارے میں شک و شبہ ہے یا تم کسی مصیبت کا شکار بننے والے ہو۔ بلکہ تمہیں دین کے بارے میں جو شک ہے اس پر مجھے تم سے ھمدردی ہے۔ لیکن میں اس بارے میں تمہیں ملامت بھی نہیں کروں گا کیونکہ تم جس معاشرے میں جس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہو اور تمہارے گرد و پیش میں جو کچھ ہو رہا ہے اور رھنماؤں، واعظوں اور مذھبی رھنماؤں کی جو عملی زندگی تمہارے سامنے ہے، ان سب کا تقاضا یہی ہے کہ تم اس زندگی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھو جو بے مقصد ہے اور وقار سے خالی۔ میں نے خود زندگی کا یہ دور دیکھا ہے جس سے کہ تم اب گزر رہے ہو س لئے میں تمہیں کسی قسم کی ملامت نہیں کروں گا۔ لیکن میرے دل میں جو آگ جل رہی ہے اور جس ندامت سے مجھے واسطہ پڑا ہے، وہ شب و روز میرا پیچھا نہیں چھوڑتی، اگر تمہیں اس کا علم ہوجائے تو تم خود اس راہ کو جس پر تم چل رہے ہو، چھوڑ دو۔ اگر ہم تنہائی میں لوگوں سے یک قلم الگ ہو کر اپنا محاسبہ کریں اور اپنے گناھوں پر نادم ہوں، تب بھی شاید ہم اپنے دلوں کی سیاھی کو نہ دھو سکیں۔ یہ بس اللہ ھی کا لطف و کرم ہے جو انسانی عقل کے سامنے سچائی کی راہ

کھولتا ہے۔،، راہب کی باتیں سننے کے بعد فلسفی نے اس سے درخواست کی کہ وہ (راہب) اسے اس کی موجودہ زندگی سے نجات دلائے۔ کیونکہ ...... اس نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی عقل کو لے کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جو قیصر کی حکومت سے باہر ہو۔ راہب نے جواب میں کہا کہ میں فلسفیوں کی محفل میں نہیں بیٹھا اور نہ ہی میں نے ان کی کتابوں کو پڑھا ہے جیسا کہ تم نے پڑھا ہے۔ میں نے اپنی زندگی تجارت اور مادی فوائد کے حصول میں صرف کی ہے۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم اپنے آپ پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال رہے ہو۔ ہمیں عقل اس لئے نہیں دی گئی کہ ہم اسے لے کر بھاگ جائیں بلکہ اس لئے دی گئی ہے کہ برائی کا مقابلہ کریں اور اس پر قابو پائیں۔ عقل زاویہ نشینی کا ذریعہ ہے اور نہ ہی عیش و عشرت کی راہ، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں، اپنے دلوں کی کمزوری اور فریب نفس کو چھپاتے ہیں۔ اس کے برعکس عقل ایک روشنی ہے اور روشنی کا مزاج یہ ہے کہ وہ تاریکی سے شکست کھاتی نہیں بلکہ شکست دیتی ہے۔ . . . تم فلسفی ہو اس لئے میں سقراط کی مثال دوں گا کہ اس نے یونان میں رہ کر جیل میں جانا قبول کیا اور ایسے ہی موت کو لیکن وہ یونان سے نہیں بھاگا بالآخر وہی کامیاب ہوا۔ اسی طرح حضرت مسیح روس حکومت سے یا یہودیوں کے ڈر سے کہیں نہیں گئے انھوں نے ان دونوں کی طرف سے آنے والی ہر مصیبت کو برداشت کیا اور بالآخر ان دونوں پر مسیح نے کامیابی حاصل کی۔ میرا تم سے کہنا یہ ہے کہ تم اپنی عقل کو لے کر یہاں سے بھاگنے کا ارادہ ترک کر دو۔

طہ حسین نے راہب کی زبانی فلسفی کو اس کی فکری لغزشوں پر، جنھوں نے ''عقلی آزادی،، کا روپ دھار رکھا تھا، متنبہ کیا۔ یہ طہ حسین کا اعجاز بیان ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے طہ حسین راہب کے پردے میں خود ہی بول رہے ہیں، حضرت مسیح اور سقراط کی داستان رنج میں خود اپنی داستان سنا رہے ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا تھا کہ طہ حسین کے عقائد، افکار و نظریات تنقید کا نشانہ بنے، ان کا نشیمن بجلیوں کی زد میں رہا،

لیکن انھیں میدان چھوڑنے یا مصر سے بھاگنے کا نہ صرف کبھی خیال نہ آیا بلکہ وہ برابر برق خرمن سوز کو دعوت بھی دیتے رہے۔

گورنر ھاؤس کی یہ محفل برخاست ہوگئی لیکن راھب اور فلسفی برابر اپنی گفتگو میں مصروف رہے۔ حتی کہ راھب گورنر ھاؤس سے اٹھ کر فلسفی کے گھر چلا گیا۔ اس نے بات چیت میں انتہائی وقار کے ساتھ فلسفی سے کہا کہ تم عقل کے بارے میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کر رہے ھو اور اس کی بساط سے زیادہ اس پر بوجھ ڈال رہے ھو۔ اس کہنے سے میرا مقصد یہ ھے کہ انسانی جسم میں اور بھی ایسے فطری غرائز ھیں جن پر عقل کا کوئی بس نہیں چلتا۔ مثلاً بھوک، پیاس۔ اگر ساری دنیا کی عقل یکجا ھوجائے تب بھی آپ کے جسم کو بھوک یا پیاس کی تکلیف سے نجات نہیں دلاسکتی۔

جس طرح جسم کھانے پینے کا محتاج ھے اسی طرح انسانی روح ایمان کی۔ اگر تم ایمان کو کھو دو تو اس سے انسانی روح کو وھی تکلیف ھوگی جو جسم کو بھوک سے ھوتی ھے۔ فلسفی نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری روح ایمان کی محتاج ھے اور انکار کی زندگی سے بیزار، لیکن میں ایمان کے بارے میں ضرور بات کرنا چاھتا ھوں۔ راھب نے کہا کہ عقل کے سامنے بعض اوقات فطرت سر جھکا دیتی ھے۔ جس سے عقل کو اپنے بارے میں غلط فہمی پیدا ھوجاتی ھے اور غرور کا شکار، لیکن وقت نے بار بار اس امر کو ثابت کر دیا ھے کہ فطرت عقل کی تیار کردہ زنجیروں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ تم انجیل میں پڑھتے ھو کہ برص اور کوڑھ کے مریض سے کہنے والے نے کہا کہ شفایاب ھو جاؤ وہ مکمل طور پر صحت مند ھو گئے، تم اپنی عقل سے اس کی تشریح نہیں کرسکتے۔ ایسے ھی انجیل نے کہا کہ ایک آدمی پانی پر چل رہا ھے، کیسے؟ عقل جواب دینے سے قاصر ھے۔ یا تو تم لوگوں میں معروف باتوں کا اقرار کرو یا پھر انکار۔ درمیانی کوئی راہ نہیں ھے۔ اور اگر تم اس کا انکار کرو تو پھر قدیم خداؤں سے کیوں مطمئن ھو؟ حالانکہ ان کا معاملہ حد سے زیادہ مہمل ھے۔ اور عقل کی گرفت سے بالکل

باهر۔ فلسفی نے کہا میرے نزدیک پرانے قدیم خداؤں کا انکار کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ ایسے ہی انجیل جس نئے خدا کی خبر دے رہی ہے، اگر وہ بھی میری سمجھ میں نہ آئے تو میں اس کا بھی انکار کرتا ہوں۔ راہب نے کہا کہ تم اپنی فطرت کے اعتبار سے قدیم خداؤں یا نئے خدا پر جس کو دوام حاصل ہے، ایمان لانے کے لئے مجبور ہو۔ اس لئے کہ تم اس ایمان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ جیسا کہ تمہارا جسم کھانے اور پینے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس گفتگو کے بعد فلسفی نے محسوس کیا کہ اس نے عقلی آزادی یا مذہب کے بارے میں جو رائے قائم کر رکھی تھی، وہ اب پریشانی کا شکار ہو گئی ہے۔ راہب نے واپسی کی اجازت چاہی تو فلسفی نے کہا کہ تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ تم ہی ایک ایسے آدمی ہو جو میرے دوست ہو اور تمہارا گھر ہی ایک ایسی جگہ ہوگی جہاں مجھے سکون مل سکے گا۔

اس کے بعد طہٰ حسین نے تفصیل سے لکھا کہ گورنر کا مصاحب فلسفی اپنے دوسرے ساتھی کو بتائے بغیر کسی طرح اپنے مکان کو چھوڑ کر صحرا کی طرف نکل گیا اور جب راہب گورنر سے اپنی ملاقاتیں ختم کرنے کے بعد اپنی خانقاہ میں پہنچا وہاں اس نے اپنے فلسفی دوست کو پایا، فلسفی نے راہب سے کہا کہ میں عیش و عشرت کی زندگی اور دنیا کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا ہوں اور جو کچھ میں اپنے ساتھ لایا ہوں اسے میں نے خانقاہ کی نذر کر دیا ہے تاکہ اسے مسافروں اور غریبوں پر خرچ کیا جا سکے۔ فلسفی چند دن تک راہب کے پاس رہا اس کے بعد بوڑھا راہب ایک دوسرے نوجوان بحیرہ نامی راہب سے ملا۔ نوجوان راہب نے بوڑھے سے کہا کہ میں نے ایک بارہ سالہ بچے کو اپنے چچا کے همراه تجارتی قافلہ میں دیکھا ہے اور قافلہ کی میں نے میزبانی بھی کی ہے۔ بچے کے بارے میں، میں نے اس کے چچا سے پوری معلومات حاصل کرلی ہیں۔ مجھے اس بارے میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ یہ بچہ آگے چل کر زمین و آسمان کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑے گا۔ نوجوان راہب کی گفتگو نے فلسفی کی بے چینی میں اور اضافہ کردیا۔ اور بچے کو دیکھنے

کے لئے بے قرار ہوگیا۔ چنانچہ فلسفی نے اپنی نئی زندگی کے لئے بوڑھے ساتھی راھب سے اجازت لے کر بحیرہ کے ساتھ صحرا کا سفر شروع کیا۔ اس سفر میں فلسفی اور راھب برابر زندگی کے مسائل پر بات چیت کرتے رہے۔ راھب نے محسوس کیا کہ فلسفی ابھی تک زندگی کے تلخ حقائق سے پوری طرح آگاہ نہیں ھے اور وہ صرف عقل ھی پر اعتماد کئے ہوئے ھے۔ راھب نے فلسفی سے کہا کہ ابھی تک وہ عقل پر غیر معمولی بھروسہ کئے ہوئے ھے۔ حالانکہ تجربات، آزمائش اور ابتلاء سے انسانی روح کو بالیدگی ملتی ھے اور قلب کو صفائی، کچھ تعجب نہیں کہ جس معمہ کو تمہاری عقل حل نہیں کر پائی، اس کا حل شاید ابتلاء کے پاس نکل آئے۔ آنے والے واقعات نے بتایا کہ راھب کی آنکھیں پردہ مستقبل میں سے ظہور میں آنے والے واقعات کو دیکھ رہی تھیں۔ فلسفی ایک دن صحرا میں اکیلے سفر کر رہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ اسے گرفتار کر لیا گیا ھے۔ تین دن تک اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی رھی۔ اور ھاتھ پاؤں میں رسیاں۔ اس کے بعد اس نے چند صحرا نشین بدوؤں میں اپنے آپ کو غلام کی حیثیت سے پایا۔ اب اس کا کام اپنے قبیلے کے آدمیوں کی خدمت کرنا اور سر شام اونٹ چرانا تھا۔ اب یہاں زندگی نے ایک نیا لباس پہن لیا۔ اب نہ تو یہاں گورنر ھاؤس کی رنگ رلیاں تھیں، جس سے وہ خود اکتا گیا تھا۔ اور نہ ھی صحرا نشین راھبوں کی ھم نشینی، جس سے وہ تسکین پاتا تھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ سخت کوشی کی یہ نئی زندگی اس کے لئے نیا پیغام لائی ھے۔ اور وہ اس سے بہت خوش ھے۔ کیونکہ یہ زندگی تکلفات سے آزاد تھی اور فرسودہ رسم و رواج کی قیود سے بے پرواہ، اس نئی زندگی سے جو سخت کوشی سے تعبیر تھی، جو لطف پایا، وہ اسے گورنر ھاؤس کی بزم عشرت میں بھی میسر نہیں آیا تھا، آخر کیسے میسر آتا؟ عبدالرحمان بجنوری نے سچ کہا ھے: عیش و نشاط دنیا کمزوروں اور کم ظرفوں کا حصہ ھے، جو رندان آتش نوش ھیں، ان کے لئے شراب غم مخصوص ھے جو کیف رنج سے معمور ھے۔“ ھر چند وہ کہنے کو ایک غلام تھا مگر

قبیلے کے لوگوں نے اسے اپنے خاندان کا سعبر بنا لیا اور اسے وہ ''صبیح،، کے نام سے پکارتے۔ ایک مدت تک وہ اس قبیلے میں رہا۔ اور اب اس کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ لیکن اس کے دل میں کسی سے ملنے کی آگ برابر بھڑک رہی تھی۔ ایک دن اچانک اس نے دیکھا کہ اس کے قبیلے کلب بن وبرہ میں ایک معزز اور باوقار بوڑھا آدمی مہمان بن کر آیا ہے۔ جب اسے پتہ چلا کہ یہ بوڑھا مہمان قریش سے تعلق رکھتا ہے، تو اسے بے حد مسرت ہوئی۔ اس نے بوڑھے سے مل کر قریش اور قریش کے ایک نوجوان فرزند محمد بن عبداللہ کے بارے میں معلومات پوچھنا شروع کیں، بوڑھے کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ یہ روسی غلام والہانہ انداز میں قریش اور خاص طور پر محمد بن عبداللہ کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ آخر محمد بن عبداللہ سے اس کا کیا تعلق ہے ؟ ایک رات کو غلام نے بوڑھے کو اپنی پوری داستان سنائی اور بتایا کہ میں جس آدمی کے بارے میں تم سے کرید کرید کر معلومات حاصل کر رہا ہوں اسی آدمی کی خاطر میں نے یہ سارا سفر اختیار کیا ہے، عیش و عشرت کی زندگی کو چھوڑا، خانقاہ میں پناہ لی اور پھر عشق کے ہاتھوں غلامی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا، جیسے تم خود دیکھ رہے ہو۔ جس آدمی کے بارے میں تم سے بار بار بات کر رہا ہوں اور جس کے رخ انور کو دیکھنے کے لئے میں نے صحراؤں کو طے کیا ہے، وہ آدمی عنقریب بنی نوع انسان کو ایک نیا پیغام دینے والا ہے۔ جب بوڑھے مہمان نے جو زید بن عمرو کے نام سے معروف تھا، اور خود اهل مکہ کے مذہبی افکار اور رومن شاهنشاهیت کے سرکاری مذہب سے بیزار تھا، غلام کی یہ باتیں سنیں تو اس کا دل بھر آیا اور اسے پتہ چلا کہ انسان کی ظاهر بیں آنکھیں کس طرح صاحب نظر اور اهل درد کو پہچاننے میں ٹھوکر کھاتی ہیں۔ اس ادراک کے بعد اس نے اپنے میزبان قبیلے سے کہا کہ وہ ان سے حسن سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ میزبان قبیلے نے اپنی روایات کے مطابق معزز مہمان سے کہا کہ اس کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ مہمان نے اپنے میزبان قبیلے سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس غلام کو اپنے لئے لینا چاہتا ہے۔ اهل قبیلہ نے قریش کے

معزز سہمان سے کہا کہ یہ غلام آپ کا ہے۔ اس پر سہمان نے اپنے میزبان کا شکریہ ادا کیا۔ اور برسر عام یہ اعلان کیا کہ اب یہ میرا غلام ہے اور میں اسے آزاد کرتا ہوں۔ تم سب گواہ رہنا۔ غلام نے جب یہ دیکھا کہ ابتلا کا یہ نیا دور کس خوش اسلوبی سے ختم ہوا ہے تو اس نے با چشم نم اپنے معزز سہمان کے ہاتھ چومے اور پھر دونوں دیار حبیب کی جانب روانہ ہو گئے۔

دونوں کی منزل حجاز تھی۔ دونوں اسی نوجوان قرشی کی باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ جس سے انسانیت کی امیدیں وابستہ تھیں۔ زید بن عمرو نے اپنے فلسفی ساتھی کی داستان تو سن لی تھی اب اس کی اپنی باری تھی۔ زید نے اپنے طویل سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ مکہ میں اپنے تین اور ساتھیوں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن حویرث۔ کی طرح دین کے بارے میں ایک مدت تک کشمکش میں مبتلا رہا اور اس دینؔ کی تلاش میں ہم سب لوگ روم پہنچے تھے۔ جہاں عیسائی راہبوں اور یہودی عالموں سے گفت و شنید جاری رہی۔ جس کے نتیجہ میں ورقہ بن نوفل اور عثمان عیسائی ہو گئے اور ورقہ نے واپس مکہ آ کر قیام کیا اور عیسائی مذہب کے مطابق اپنی بود وباش اختیار کی، لیکن میں دونوں سے یعنی یہودی علماء اور نصرانی راہبوں سے متاثر نہ ہوا، لیکن ہم نے کبھی بھی بت پرستی میں حصہ نہیں لیا بلکہ ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا تھا کہ قریش کے بڑے بڑے سردار پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہو رہے ہیں۔ اسی تلاش میں مجھے بتایا گیا کہ دین ابراہیم کی تجدید کا سہرا مکہ کے سر ہو گا۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ میں اپنے وطن میں رہ کر مذہبی زندگی سے مطمئن نہیں تھا اور تلاش حق میں تمہارے وطن پہنچا اور ادھر تم اپنے وطن میں مذہبی زندگی سے بیزار تھے۔ اور سچائی کی تلاش میں ہمارے وطن آئے اور پھر اس تلاش حق نے ہم دونوں کو یکجا کر دیا۔ یہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ فلسفی کے والہانہ ذوق و شوق کو دیکھ کر زید اس سے کہتے جاتے کہ ہم چند دنوں تک حجاز پہنچ جائیں گے اور اس

نوجوان کی جو آگے چل کر عظیم الشان پیغمبر کے مقام پر پہنچنے والا ہے، تائید اور حمایت میں ہم سب کچھ کریں گے - اس سفر میں ان کا گزر وادئی بنی لخم سے ہوا اس قبیلے کے بدوؤں نے یہ خیال کر کے کہ یہ دونوں مسافر مالدار نظر آتے ہیں، دونوں پر حملہ کرکے دونوں کو شہید کر دیا۔ موت کے وقت دونوں کی زبان پر محمد بن عبداللہ کا نام تھا اور دل عشق سے روشن، اچانک آسمان سے نور کی ایک لکیر نمودار ہوئی جس نے ان دونوں پاکیزہ روحوں کو اپنی آغوش میں لے لیا -

طہ حسین نے ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ زید کے بیٹے سعید اور عمر بن خطاب نے جو زید کے چچازاد بھائی ہیں، رسول کریمؐ سے کہا کہ زید بن عمرو کے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں - آپ نے فرمایا ٹھیک ہے زید بن عمرو اپنی ذات میں ایک امت کی حیثیت سے (روز حشر) اٹھائے جائیں گے -

جس ہستی کی خاطر ان دونوں نے سفر کیا تھا وہ جوانی کی منزلیں طے کرتی ہوئی ۲۵ سال کو پہنچ چکی تھی - فطرت خود ان کی تربیت کر رہی تھی اور وہ یوں کہ آپ بہت ہی کم معاوضے پر اہل مکہ کی بکریاں چراتے، نیز جب کبھی قریش مکہ کا ضمیر بیدار ہوتا اور وہ مظلوم اور کمزور انسان کی بھلائی کے لئے کوئی معاہدہ کرتے، تو اس میں یہ پاکیزہ سیرت نوجوان بھی شریک ہوتا - قریش نے ایک ایسا ہی معاہدہ حلف الفضول، کے نام سے کیا - جس میں آپ شریک ہوئے، اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۰ سال کی تھی - قریش کی ایک معزز خاتون جو اس نوجوان کی والدہ ماجدہ کی سہیلی تھیں، محمد بن عبد اللہ کی زندگی کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتی رہیں - حتی کہ اس نے آپ کو اپنی تجارت میں شریک کر لیا - ایک قافلے کے ہمراہ شام بھیجا - اس سفر میں اس معزز خاتون کا غلام بھی محمد بن عبداللہ کے ساتھ تھا - سفر سے واپسی پر غلام نے معزز خاتون کو محمد بن عبداللہ کے پاکیزہ اخلاق اور گفتگو کا حال تفصیل سے سنایا - خود اس خاتون کا بھی یہی مشاہدہ تھا - یوں نظر آتا تھا کہ اس نوجوان کے کندھوں پر جو جوانی کی شاہراہ عام سے ہٹ کر زندگی

بسر کر رہے تھے، ایک ادھیڑ عمر دانشمند کا سر رکھ دیا گیا ہے۔ اس معزز خاتون نے جو آگے چل کر مسلم تاریخ میں ام المومنین کے نام سے معروف ہوئیں۔ محمد بن عبداللہ سے شادی کی درخواست کی۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے اپنی محفلوں میں تعجب سے یہ خبر سنی اور کہا کہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب نے جو کل تک چند ٹکوں کے معاوضے میں ہماری بکریاں چراتے تھے، خویلد کی بیٹی خدیجہ سے شادی کر لی ہے! اس پر قریش کے دوسرے سردار نے کہا کہ بدبخت! کیا تمہیں علم نہیں وہ عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور وہ امین ہیں۔ کیا قریش میں کوئی دوسرا ایسا آدمی ہے جو خدیجہ کے لئے عبد المطلب کے بیٹے سے زیادہ مناسب ہو اور کون ہے جو اس امین کے مقابلے میں آسکے؟

یہ عجیب اتفاق ہے کہ قریش کے ایک دوسرے آدمی نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ زمزم کے چشمے سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ جس نے آہستہ آہستہ پھیل کر ساری عرب سر زمین کو روشن کر دیا ہے۔ اس نے اپنا یہ خواب اپنے بھائی کو سنایا، بھائی نے جواب میں کہا کہ تم نے واقعی عجیب خواب دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس واقعہ کا ظہور عبد المطلب کی اولاد میں ہوگا، کیونکہ تم نے زمزم سے روشنی پھوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔

طه حسین نے سیرت نگاری میں اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کی اور ایک نئے انداز سے نبوت کی عظمت کو آشکار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے صاف شفاف اسلوب بیان کے بل پر ان تمام پردوں کو چاک کرنے میں کامیاب ہوگئے جو مدعیان علم و مذہب، نے ایمان و عقل اور مذہب و فلسفہ کے نام پر لوگوں کی نگاہوں پر ڈال رکھے تھے۔ طه حسین نے بتایا کہ مذہب اور فلسفہ ایک ہی منزل کا پتہ دیتے ہیں، نیز یہ کہ عقل کی خوبیاں مسلم، اس کے کمالات درست، لیکن اسے نبوت کے سامنے سر جھکائے بغیر چارہ نہیں۔ ہر چند طه حسین کے بیان میں بعض مقامات پر طوالت بھی آجاتی ہے اور وہ ایک ہی بات کو بار بار دہراتے بھی ہیں، لیکن ان کے اسلوب بیان کی روانی اور حسن معنی کی تابانی کے سامنے اس قسم کی خامیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔